بلند اقبال بیگم (بنت یگانہ)

بھائی ابا

میں نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ مشرقی تہذیب کا آخری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں شرفا کے گھروں کا عام طور پر یہی دستور تھا کہ مرد گھریلو معاملات میں زیادہ دخیل نہ ہوتے تھے۔ بیوی بچوں کے ساتھ بھی تعلقات ایک خاص حد تک رہتے۔ چونکہ ایک خاندان کے جملہ افراد زیادہ تر ساتھ ہی رہنے میں سب کی بہتری سمجھتے تھے۔ لہٰذا بچوں کی تربیت ونگہداشت گھر کے بزرگوں کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ مردوں کو اپنے کام سے کام۔ زیادہ تر وقت ان کا گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔ برخلاف اس کے بابا کے گھر والوں میں کوئی لکھنؤ میں نہ تھا، اس لیے وہ ہمیشہ علیحدہ مکان کرائے پر لے کر رہتے تھے۔ حالانکہ میرے نانا ابا کا مکان خاصا بڑا تھا اگر رہنا چاہتے تو وہ رہ سکتے تھے مگر انہوں نے سسرال میں رہنا پسند نہ کیا۔ سوائے ایک مختصر عرصے کے وہ بھی جب ایسے ہی مجبور ہو گئے تب۔ پھر اٹاوہ چلے گئے۔ بعد میں ہم لوگوں کو بھی وہیں لے گئے۔ میری یادداشت کا سلسلہ ڈھائی تین سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ۲۲-۱۹۲۱ء تھا۔ اس دور کے کچھ واقعات ذہن میں محفوظ ہیں جن کا ذکر میں اختصار سے کہیں کہیں کروں گی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس دور کے مرد عموماً گھریلو معاملات اور بچوں کی ذہنی تربیت میں دلچسپی نہیں لیتے تھے لیکن میرے بابا کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ انہیں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہم لوگ

صبح کو آنکھ کھلتے ہی پہلے کلمہ پڑھتے، پھر گھر کے سب بڑوں کو سلام کرتے، اس کے بعد دانت صاف کر کے منہ ہاتھ دھونے کے بعد کسی دوسری طرف متوجہ ہوتے۔ میں نے شروع سے آخر تک ہمیشہ یہی دیکھا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی نہایت سادگی سے بسر کی اور ہم سب کو بھی یہی تربیت دی۔ بابا کی ہدایت تھی کہ ان کے لیے کھانے کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا جائے جو کچھ پکتا تھا سب بال بچوں کے ساتھ خوش ہو کر دسترخوان پر ہم سب کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور کھانے کے ضمن میں آدابِ طعام کی تربیت بھی دیتے جاتے۔ اگر کھانا اچھا پکتا تو تعریف ضرور کرتے اور اگر کوئی چیز ناپسند ہوتی تو خاموشی سے جتنا کھا سکتے کھا لیتے تھے اور تنبیہ کرتے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر ہرگز کسی کھانے کی برائی نہ کرو بلکہ خاموشی اختیار کرو۔ اگر کہیں دوسری جگہ کھانے کا اتفاق ہو تو تمیز سے کھاؤ اور کبھی گر پڑ کے نہ کھاؤ۔ دور رکھی ہوئی چیزیں ہاتھ بڑھا بڑھا کر اپنی طرف نہ کھینچو۔ ہمیشہ بھوک سے کم کھاؤ۔ جب کھا چکو تو اللہ کا شکر ادا کرو اور رزق کو سلام کر کے دسترخوان سے اٹھو۔ رزق کی بے حرمتی کبھی نہ ہونے دیتے۔ اگر کبھی چھوٹا سا روٹی کا ٹکڑا دیکھتے اور یہ امکان ہوتا کہ اس پر کسی کا پیر پڑ جائے گا تو خود اسے اٹھا کر چوم کے کہیں کنارے رکھ دیتے۔ دوسروں کے ہاں دعوت میں جانے کو پسند نہ کرتے، زیادہ تر خوش اسلوبی سے ٹال ہی دیا کرتے تھے۔ اپنے گھر آئے مہمان کی اپنی وسعت سے زیادہ خاطر تواضع کا اہتمام کرتے۔ کھانے کے لیے ہم لوگوں کو تاکید تھی کہ کبھی غصے یا رنج کی حالت میں کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ بلکہ جب مزاج بالکل نارمل ہو اس وقت خوش ہو کر کھاؤ اس طرح غذا جزوِ بدن ہوتی ہے۔ غذا ان کی ہمیشہ بہت کم رہی۔ کہتے تھے کہ زیادہ کھانے سے طبیعت بوجھل اور ذہن کند ہو جاتا ہے لہٰذا بھوک سے ہمیشہ کم کھانے کی عادت سے انسان زیادہ کام کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہم سب کو بزرگوں سے، برابر والوں سے اور چھوٹوں سے گفتگو کرنے کے طور طریقوں اور آداب سے باتوں باتوں میں آگاہ کرتے رہتے۔ خوب و زشت دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دوسرے لوگوں کے تذکرے کے ضمن میں یا ہمیں لوگوں کی کسی غلطی پر برابر ٹوکتے اور اصلاح کرتے رہتے۔ حد ہے کہ جب ذرا سمجھداری کا زمانہ آیا تو خط و کتابت کرنے کا سلیقہ، رشتے یا مرتبے کے لحاظ سے القاب و آداب استعمال کرنے کا شعور پیدا کیا۔ اس زمانے میں ایک عام رواج تھا کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ آخر میں حقیر، فقیر، پرتقصیر، کمترین، کنیز، ناچیز، گناہگار، خدمت گار جیسے الفاظ ضرور استعمال کرتے تھے مگر انہوں نے ایسے الفاظ ہم لوگوں کو استعمال کرنے سے تاکیدی طور پر منع کیا تھا کہ کیوں اپنے کو کسی کے سامنے اتنا کمتر اور حقیر کر کے پیش کیا جائے، باوقار انسان کے لیے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی خودی کو

ناحق مجروح کرے۔ کسی اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے، انسان اپنی عزت کا خود لحاظ اور پاس کرتا ہے تب ہی دوسرے بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ بزرگوں، خردوں، برابر والوں سے گفتگو کے آداب اور طور طریقے۔ پانی کسی بڑے کو دو تو اس طرح کہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر گلاس رکھ کر داہنے ہاتھ سے پکڑ کر ذرا جھک کر پیش کرنا چاہیے۔ سلام کرو تو گردن کو ہلکا سا خم دے کر ہاتھ سے کرو، یہ نہیں کہ زبان سے ڈھیلا کھینچ مارا کہ فرض ادا ہو گیا۔ جب تک سلام کرنے کا انداز صحیح نہ ہو گیا، باقاعدہ اس کی ریہرسل کراتے تھے۔

وہ خود اپنے بزرگوں کا بہت ادب واحترام کرتے۔ جب بھی نانا ابا کے ہاں جاتے یا وہ ہمارے گھر آتے تو بہت ادب سے ان کو سلام کرتے، نگاہ نیچی رکھ کر ان سے گفتگو دھیمے لہجے میں کرتے۔ اونچی آواز میں بات کرنا یا سننا قطعی ناپسند تھا۔ روزمرہ کی گھریلو زندگی میں بھی ہمہ وقت ان باتوں کا دھیان رکھتے کہ کوئی ناشائستہ بات بچے کسی سے نہ سیکھ لیں۔ کبھی کسی کو کوئی چیز دینا ہے تو اچھال کر نہ دی جائے بلکہ پاس جا کر دو اور ہمیشہ داہنے ہاتھ سے دو اور اگر کسی سے لو تب بھی سیدھے ہاتھ سے لو۔ بڑا کوئی چیز دے تو سلام کر کے لو۔ بزرگوں کے ساتھ راستہ چلتے ہوئے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ باتیں کرتے میں اگر تم بھی کچھ کہنا چاہو تو ذرا صبر سے کام لو، پہلے بڑے کی بات ختم ہونے دو پھر اپنی کہو۔ ہاتھ ہلا ہلا کر یا آنکھیں مٹکا کر بات کرنے پر بچپن ہی سے روک ٹوک رکھتے تھے۔ اکثر گھروں میں اظہار خیال کے لیے عامیانہ الفاظ رائج تھے، ہمیں ان کے استعمال کی ممانعت تھی۔ کسی لفظ کے غلط تلفظ پر وہ برہم ہوتے۔ چھچھورا پن، اترا ہٹ یا شیخی بگھارنے سے سخت نفرت کرتے۔ جن اشخاص میں یہ صفات پائی جاتی تھیں ان سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

خوش حالی نہ ہونے کے باوجود ہمارے گھر میں کوئی ایسا محاورہ استعمال نہ ہوتا جس سے طبقاتی پستی کا اظہار ہوتا ہو۔ زبان کے معاملے میں خاص طور پر ہر وقت اس کا دھیان رکھتے۔ بچوں کی آپس کی بات چیت کو بھی نظر میں رکھتے کہ کس نے کس لفظ کی صحیح ادائی نہیں کی یا مذکر و مونث میں غلطی کی۔ اپنے پاس بلا کر اس کو صحیح کرواتے، کہتے کہ بات چیت اس طرح کرو کہ زبان سے لفظ ٹھیک طرح ادا ہو، نہ بہت اونچی آواز میں بولو نہ منمنا کے کہ دوسرا تمہارا مطلب نہ سمجھ پائے۔

ایک دفعہ بہت چھوٹی عمر میں کسی سے سنا ہوا ایک مصرع کھیلتے میں میں نے گانے کے انداز میں ادا کیا، وہ کمرے میں تھے اور میں صحن میں۔ سن کر باہر نکل آئے بولے، "لاحول ولاقوۃ، گلی کے لونڈوں کے گائے ہوئے گھٹیا قسم کے گیت یا اشعار آئندہ میں تمہاری زبان سے نہ سنوں"۔ گھر میں بیوی بچوں سے

اس قدر دلچسپی لیتے ہوئے میں نے انہیں کو دیکھا۔ فرصت کے اوقات میں اکثر و بیشتر باتیں کرتے ہوئے بچوں کی صحیح ذہنی تربیت کا نہ اس وقت ہی کوئی خاص خیال رکھا جاتا تھا نہ آج کل عام گھروں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ ان باتوں کا اپنے بچوں میں خاص کر خیال رکھتے تھے۔ عزت نفس، غیرت و خودداری، ایمان داری اور سچ بولنے کی عادت کو اس طرح وقتاً فوقتاً اپنے مخصوص انداز میں جلا دیتے رہتے تھے کہ یہ عادات پختہ ہو جائیں۔ بچوں میں سے اگر کسی سے کوئی نقصان ہو جاتا اور ان کی نظر اس چیز پر پڑتی تو پوچھتے یہ کس نے کیا۔ غلطی کرنے والے نے اگر غلطی اپنی تسلیم نہ کی اور سزا سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا تو شامت آ جاتی اور اگر سچ سچ بتا دیا کہ ہم سے یہ نقصان ہوا ہے اور چپ چاپ سامنے کھڑا بھی رہے تو پھر بجائے غصے کے اس بچے پر انہیں پیار آ جاتا تھا۔ سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کے کہتے کہ ''شاباش ہمیشہ سچ بولو۔ سزا کے خوف سے جھوٹ بول کر اپنے ضمیر کو مجرم نہ بناؤ''۔ ہم لوگوں نے سچائی کی عظمت کو انہیں کے توسط سے پہچانا۔ غیرت و شرافت کا مجسم نمونہ خود ان کی ذات تو تھی ہی مگر کمسنی میں اس کا احساس کسی ننھے سے ذہن میں پیدا کرنا انہیں کا کام تھا۔

۱۹۲۱ء میں جب کہ ہم لوگ لکھنؤ میں قاضی کے باغ والے مکان میں رہتے تھے، دیوار بیچ سرحد کے ایک شاہ صاحب رہتے تھے۔ ان کی چار بیویاں تھیں۔ سب سے چھوٹی ان کی بہت چہیتی بیوی تھیں، لہٰذا وہ باقی بیویوں سے الگ کوٹھے کی اوپری منزل پر رہتی تھیں، باقی سب نیچے کے مکان میں رہتی تھیں، جو بہت کشادہ تھا اور صحن بھی بہت بڑا تھا۔ اوپر والے حصے میں ایک بڑی سی کھڑکی بھی تھی۔ چنانچہ ان کی چھوٹی بیوی سے میری والدہ کے مراسم ہو گئے تھے۔ پڑوسن کی حیثیت سے کبھی کبھی خالی وقت میں یہ دونوں اپنا دل بہلانے کے لیے ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں۔ میری عمر اس وقت تین سال کے لگ بھگ تھی۔ آغا جان اس وقت گود میں تھے۔ میں اکیلی گھر میں گھبراتی تھی، دوپہر کو نیند بھی زیادہ نہ آتی تھی۔ شاہ صاحب کی چھوٹی بیوی کے ہاں اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی۔ اماں نے ان سے کہا کہ ''اس کو آپ دوپہر میں اپنے پاس بٹھا کر الف بے پڑھایا کیجیے، کچھ اس کا بھی دل بہلے گا اور اس طرح آپ کا بھی خالی وقت کٹ جائے گا''۔ اس طرح میرا ان کے ہاں جانا شروع ہوا۔ پڑھائی تو کیا ہوتی تھی کسی وقت ایک آدھ حرف بیٹھ کر رٹ لیا جاتا تھا۔ سارا وقت کھیل یا ادھر ادھر کی باتوں میں صرف ہوتا تھا۔ اس اثنا میں اگر شاہ صاحب اوپر آ جاتے تو بس میرے دم پر بن جاتی تھی کیونکہ وہ لمبے تڑنگے قد کاٹھ کے انسان تھے اور اس پر ستم یہ تھا کہ شانوں تک ان کی زلفیں اور سینے تک گھنی لمبی داڑھی بھی تھی اور لباس لمبا کرتا اس پر کالی

واسکٹ، اونچی ٹوپی، کندھے پر چوخانہ رومال، اٹنگی شلوار، پاؤں میں چمڑودا جوتا چوہے کی دم جیسی چونچ والا۔ بھلا اس ہیئت کذائی والے انسان کو میری طبیعت کہاں برداشت کرنے کو تیار تھی۔ ذرا دیر کے لیے بھی وہ جس کام سے آئے ہوتے کر کے واپس جانے لگتے تو اپنی بیوی کو کہتے کہ ''تم اس کو پڑھاتی کیسے ہو یہ تو منہ سے بولتی ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اتنی دیر میں اس کی آواز ہی نہیں سنی یہ تو بت ہے بت۔ بالکل ساکت بیٹھی ہے اس کو بولنا ہی نہیں آتا''۔ انہوں نے میرا نام ہی بت رکھ دیا تھا۔ جب بھی مڈبھیڑ ہو جاتی تھی یہی کہتے تھے۔ ان کے ہاں جانے سے پہلے یہ اطمینان کر لیتی تھی کہ وہ اوپر تو نہیں ہیں۔ اگر شبہ بھی ہو جاتا تو واپس اپنے گھر آ جاتی نیچے۔ اماں کہتیں کہ پڑھنے کو بھیجا تھا واپس کیوں آ گئی۔ بڑی مشکل سے بتاتی کہ وہاں شاہ صاحب ہیں۔ ایک دن ان کے گھر میں خلاف معمول بہت انتظام واہتمام نظر آیا۔ نیچے کے صحن میں سفید چاندنی کا فرش لگا ہوا، قالین بچھے ہوئے، تخت کے اوپر خوب صورت ریشمی چادریں، اس پر گلدستے رکھے ہوئے۔ شام کا وقت تھا لوگ آ کر بیٹھتے جا رہے تھے۔ محفل میلاد کا اہتمام تھا۔ محلے پڑوس کے سب مرد حضرات ان کے ہاں مدعو تھے۔ چنانچہ میرے بابا کو بھی شاہ صاحب نے بہت اصرار کے ساتھ آنے کو کہا تھا، لہٰذا حق ہمسائیگی کا لحاظ کرتے ہوئے وہ بھی مغرب کے بعد، جب میلاد شروع ہو گیا تو شیروانی پہن کے جانے لگے۔ میں چونکہ کوٹھے پر سے جا جا کر وہاں کی ساری کارروائی دیکھ رہی تھی اور بہت دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی وہاں جا کر بیٹھوں۔ مگر اکیلے انہیں کے گھر زینے سے اتر کر جا بیٹھنے کی ہمت اپنے میں نہیں تھی، لہٰذا میں بضد ہو گئی کہ مجھ کو بھی اپنے ساتھ وہاں لے کر چلیے۔ پہلے تو بہت سمجھایا، جب میری سمجھ میں کسی طرح نہ آیا تو اماں سے مجھے روکنے کو کہہ کر خود دروازے سے نکل گئے، باہر سے کنڈی لگا کر۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں کہ کب رودھو کر پڑ کر سو گئی۔ صبح کو میرے سو کر اٹھنے سے پہلے وہ بازار سے شیر مال اور بالائی لا چکے تھے۔ میں جب اٹھی تو خود میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ سے اتارا، لوٹا بھر کے دہلیز پر بٹھا کے منہ دھلایا۔ تخت پر بٹھا کر نوالے بنا بنا کر کھلانے لگے اور ساتھ ہی باتیں کرنے کے انداز میں کہتے جاتے تھے کہ ''میں تم کو وہاں کیسے لے جاتا، وہاں کھانے پر صرف میرا ابلا وا تھا کوئی بچوں کا تھوڑا ہی تھا، بغیر بلائے کسی کے ہاں نہیں جاتے ہیں۔ پھر تم تو میری بیٹی ہو۔ بیٹیاں اپنی ماں کے ساتھ جاتی اچھی لگتی ہیں اور بیٹے باپ کے ساتھ۔ جب تمہاری بیوی اماں مہمان جائیں گی تو تم بھی ان کے ساتھ جانا''۔ غرض کہ یوں وہ اپنا حق اولاد کی سیرت وکردار کے بنانے میں ادا کرتے۔

گھر سے باہر نکلتے تو پانچوں کپڑوں سے درست ہو کر ہمیشہ نکلتے چاہے ذرا دور ہی کیوں نہ جانا ہو،

مگر گھر پر بھی چاہے کتنی شدید گرمی پڑ رہی ہو کرتا، بنیان کبھی نہیں اتارتے تھے۔ جب کہ عموماً لوگ اس پر قادر نہ ہوتے تھے۔ بلا کی گرمی اور حبس کی وجہ سے ایسی حالت میں ان کے ہاتھ میں پنکھا مسلسل گردش میں رہتا تھا۔ لباس میں حیدرآباد جانے سے پہلے سفید اچکن، چوڑے پائنچے کا پاجامہ، ایرانی سیاہ ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی ہمیشہ رہتی تھی۔ گرمی اور برسات کے موسم میں چھتری استعمال کرتے۔ حیدرآباد جانے سے یہ تبدیلی ہوئی کہ اچکن کی جگہ شیروانی نے لے لی۔ وہاں کی تراش خراش ان کو بہت پسند آئی۔ پھر بقیہ عمر بھی شیروانی استعمال کرتے رہے۔ جاڑے میں گرم پتلون اور جسٹر بھی پہنتے تھے۔ کپڑے کے زیادہ شوقین نہیں تھے بس صاف ستھرا سادہ لباس ہمیشہ استعمال کیا۔ لڑکوں کو ٹوپی پہننے کی تاکید رہتی، خاص کر گھر سے باہر نکلتے وقت ننگے سر ہونے کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔

بازار میں کوئی چیز لے کر کھانا بہت گھٹیا پن کی علامت سمجھتے تھے۔ خود ان کا اگر کبھی کسی چیز کو دل چاہتا تو خرید کر گھر لاتے۔ اماں کے یا جب میں ذرا بڑی ہوئی تو میرے ہاتھ میں دے دیتے، پھر سب کے ساتھ کھاتے خوش ہو کر۔ پھلوں میں ان کو انگور، سیب، قندھاری انار، اور سب سے زیادہ آم بہت پسند تھا۔ خاص کر لنگڑا آم کھاتے وقت عظیم آباد کا لنگڑا ان کو ضرور یاد آجایا کرتا تھا۔ لکھنؤ کا دسہری اور سفیدہ پسند تھا۔ نولکشور پریس کی ملازمت چھوٹنے سے پہلے ان کا معمول تھا کہ ہر چوتھے روز منڈی جا کر وہاں سے دسہری اور لنگڑے کی نیم پختہ ڈھیری مزدور کر کے لاتے تاکہ دو دن بعد تیار ہوں۔ رات کو فکر سخن میں اکثر جاگتے رہتے تھے تو دو تین بجے رات تک بار بار اٹھ کر مچان پر رکھے آموں کو دبا دبا کر دیکھتے کہ ان میں سے کوئی کاٹنے کے قابل نرم پڑ گیا ہو تو کاٹا جائے۔ سوتے میں اگر میری کبھی آنکھ کھل جاتی تو یہ منظر دیکھنے میں آتا تھا۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں ایک بہت مشہور ملائی کی قلفی والا تھا جو روشن الدولہ کی کچہری میں دن کو بیٹھتا تھا اور کبھی کبھی گرمیوں کے زمانے میں رات کو دس گیارہ بجے کسی محلے میں بھی پھیری کو نکلتا تھا۔ جو اس کی قلفی کے قدردان تھے وہ لوگ اتنی رات کو بھی اس کی آواز سن کر ضرور لے کر کھایا کرتے تھے، چنانچہ جس وقت وہ آواز لگاتا تھا ہم لوگ بے خبر سوتے ہوتے تھے، مگر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود کوئی اچھی چیز کھائیں اور ہم لوگ اس میں شریک نہ ہوں۔ زبردستی نیند کے متوالے بچوں کو جگا جگا کے اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے۔

فکر شعر و سخن وہ نہایت اطمینان کے وقت کرتے۔ جب رات کے کھانے کے بعد بیوی بچوں سے باتیں کر کے سب کے سونے کا وقت ہو جاتا تو دس بجے کے قریب لالٹین، اپنا مخصوص تکیہ، پانوں کی ڈبیا،

پنکھا اور تازہ حقہ بھر کے مردانے کمرے میں چلے جاتے۔ وہاں زمین کا فرش ہوتا جس پر ایک گاؤ تکیہ رکھا ہوتا۔ الماری میں ان کی کتابیں، ایک کاغذات رکھنے کا صندوقچہ، پیتل کا یا شیشے کا قلمدان، کلک کا قلم تراش، بہت عمدہ قلم خود بناتے تھے۔ اس کے بعد ہولڈر استعمال کرنے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں بڑے شوق سے انہوں نے اپنے لیے پارکر قلم منگایا تھا جس کو اتنی احتیاط سے انہوں نے برتا کہ وہ آخر زندگی تک ان کے پاس تھا۔ پھر نہ معلوم کس نے اس کو اڑا لیا۔ قلم پر ہی کیا موقوف ہے کیسی کیسی ان کی عزیز اور نایاب قیمتی چیزیں مسافرت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے تلف ہو گئیں جن کا ان کو دکھ محسوس ہوتا تھا۔ خیال آنے پر، خاص طور سے اپنی کتابوں کے ضائع ہونے پر، تاسف کرتے۔ بیدل اور صائب کا دیوان تو ہمہ وقت سفر و حضر میں ساتھ ہی رہتا تھا جس کی وجہ سے صائب کا دیوان تو بچ گیا بیدل کا نہ جانے کس کے ہاتھ پڑا۔ شعر کی آمد جب ہوتی تھی تو گنگناتے رہتے تھے، مکمل ہو جاتا تو ترنم سے دھیمی آواز میں پڑھتے رہتے۔ دو تین بجے رات سے پیشتر تو وہ سوتے ہی نہ تھے۔ غزل نہ کبھی کہنا ہوتی تو اپنے پسندیدہ موضوع پر مختلف کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں۔ اگر کسی مشاعرے کے لیے تازہ غزل کہنا ہوتی تو تقریباً رات کے چار بھی بج جایا کرتے تھے۔ اس اثنا میں کوئی ایسا شعر موزوں ہو جاتا جو ان کو خود پسند آ جاتا تو اکثر ایسا بھی ہوا کہ اماں کو سوتے میں جگا کر سناتے، وہ نیند کی وجہ سے پوری توجہ سے سمجھ نہ پاتیں تو کہتے، ''کیا آپ کا ذوق ہے، سبحان اللہ! کس بے دلی سے کہہ دیا کہ ہاں اچھا ہے۔ ذرا اٹھ کے سنیں تو سہی کیا شعر موزوں ہوا ہے اس وقت یا الہام ہوا ہے۔ اجی مہاراج کچھ تو داد دیں''۔ ان لوگوں کی گفتگو سے میری نیند ہوشیار ہو جاتی مگر خاموش پڑی سب سنتی رہتی تھی۔ اٹاوہ کے قیام کے زمانے میں یہ غزل اماں کو جگا کر سنائی تھی:

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

اور علی گڑھ میں بھی ایک رات جب یہ غزل کہہ رہے تھے:

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہوکر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہوکر

اس طرح وہ اپنی تازہ غزل کی داد پہلے اپنی بیگم سے ضرور لیتے تھے لہٰذا انہیں بھی اچھا خاصا ذوق شعری سنتے سنتے پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

عورت کی جس خوبی کو وہ جملہ خوبیوں پر مقدم جانتے تھے وہ اس کی وفاداری کی صفت ہے۔ اس

کے بغیر وہ عورت نہیں، ایسی عورت کو وہ ایک بدبودار پھول سے تشبیہ دیتے تھے کہ جس کو سونگھنے کی کبھی خواہش دل میں نہ پیدا ہو۔ اس سے ملتا جلتا ایک قول امام جعفر صادق علیہ السلام کا تاریخ میں دیکھنے میں آیا کہ اگر بیوی وفادار اور امین ہے تو پھر اس کی ساری غلطیاں اور کمزوریاں نظر انداز کرنے کے قابل سمجھو۔ اس کی وجہ سے مرد کو طمانیت قلب حاصل رہتی ہے اور وہ یکسوئی سے اپنے کاروبار زندگی میں بھرپور طریقے سے حصہ لے سکتا ہے۔ اتنے مختصر سے جملے میں نفس انسانی کی رہنمائی کے لیے کتنی گہری بات بتا دی گئی ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کے زیر اثر جس معاشرے کی تشکیل ہوئی، اس میں تو عام طور سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بالکل معمولی اور غیر اہم باتوں کو اتنی اہمیت دی جانے لگی کہ گھریلو زندگی کا چین تباہ کر کے نہ صرف دو زندگیاں بلکہ ان کے ساتھ جملہ متعلقین کے لیے بھی نت نئے مسائل و مصائب کا دروازہ کھول دینا معمولی بات سمجھی جانے لگی۔ کردار کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کا اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ شعر انہوں نے اسی پس منظر میں کہا ہے:

حسن چمک اٹھا تو کیا بوئے وفا تو اڑ گئی
اس نئی روشنی نے آہ دل کا کنول بجھا دیا

خواتین کا احترام جس طرح ان کو کرتے دیکھا اس کا عشر عشیر بھی مہذب و متمدن ترقی یافتہ زمانہ نہیں پیش کر سکتا۔ وہ خود اپنے گھر میں بھی آواز دیے بغیر کبھی داخل نہیں ہوتے تھے۔ ہمیشہ دروازے پر ٹھہر کر آواز دیتے تھے کہ میں آ رہا ہوں اور ہاتھ کی چھڑی سے کھٹ کھٹ کر دیتے تھے۔ جب اندر سے کوئی کہہ دیتا کہ آ جائیے تب آتے۔ اس کے پس پشت یہ خیال تھا کہ کوئی پردہ دار خاتون محلے پڑوس کی نہ بیٹھی ہوں یا اپنے ہی گھر کی خواتین اگر ہوں تو نہ جانے کس طرح سے بیٹھی ہوں کیونکہ گرمی کے سبب اکثر مردوں کے باہر جانے پر خواتین دوپٹے سے بے نیاز ہو کر گھر کے اور بچوں کے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتی تھیں، بے فکری کے ساتھ۔ عورت کا احترام اپنے عمل سے جس طرح انہوں نے کر کے دکھایا، اس زمانے میں بھی اس کی مثال شاذ و نادر ہی کہیں ملتی تھی۔ عام طور سے اس طرح کی پابندی اپنے اوپر ہمہ وقت لگانے کا کوئی مرد روادار نہیں ہوتا تھا۔ کہتے تھے کہ جو شخص عورت کی عزت اور اس کا احترام نہیں کر سکتا اس کو شرافت چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ گھر کی خواتین ہی ہم مردوں کی عزت و ناموس کی امین ہوتی ہیں۔ اگر ہم نے ان کو مقام نہ دیا جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہیں تو پھر ہم نے ان کو کیا دیا؟ ان میں وفا شعاری، تمام عمر کے لیے ساتھ مرنے اور بھرنے کا عزم و حوصلہ کیسے پیدا ہوگا جو ہم تکریم و تعظیم سے بھی ان کے ساتھ

پیش نہ آئیں لے اور حقیقت بھی یہی دیکھنے میں آئی کہ حسن معاشرت و نرم خوئی، آپس کا پُر خلوص برتاؤ ہی تھا جس کے سبب پورے سات سال ۲۳ء سے لے کر ۲۹ء تک کا وہ پر آشوب زمانہ جب کہ بابا کا ستارہ گردش میں تھا جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کس طرح میری ماں نے صبر و سکون کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھوک کی نقاہت سے کملائی ہوئی صورتیں دیکھیں۔ ایسے عالم میں ماں کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے وہ تو الگ بات رہی بچوں کو اس صورت حال کے جھیل جانے کا حوصلہ دلانا اور اپنی اضطراری کیفیت کو کسی پر ظاہر نہ کرنا، گھر میں آنے جانے والوں کو یہ پتا نہ چلتا تھا کہ اس گھر میں دو دو تین تین دن بعض اوقات چولہا جلنے کی نوبت نہیں آتی۔ کیا پیغمبرانہ شان سے وہ زمانہ گزارا ہے۔ اگر اس طرح کا تعاون ان کی طرف سے نہ ملتا تو بابا ہر قدم پر تو اتنی استقامت سے، بغیر کسی دنیاوی سہارے کے اپنے مشن کی دشوار گزار راہوں سے گزر جانے کا حوصلہ کب تک قائم رکھ سکتے تھے۔ آبائی مکان پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مال دنیا میں کچھ قیمتی نایاب کتابیں اور معمولی سی گرہستی تھی جو اس آڑے وقت میں کچھ دن کام آئی۔ اس وقت میرے منجھلے ماموں یو پی کے ایک چھوٹے سے مقام کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ اس نازک صورت حال کے پیش نظر انہوں نے بڑی مشکل سے بھائی ابا کو اس بات پر راضی کیا کہ میں بہن اور بچوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ ان کی طرف سے بے فکر ہو کر تلاش معاش کر سکیں۔ نہ چاہنے کے باوجود انہوں نے ماموں جان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم سب کو ان کے ساتھ جانے دیا۔ غرضیکہ وہاں دیہات اور اکیلے کوارٹر میں اماں دس بارہ روز سے زیادہ نہ ٹھہر سکیں، بھائی صاحب سے کہا مجھ کو واپس پہنچا دیجئے۔ حالانکہ وہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ کھانے پینے کی تمام اشیاء افراط سے گھر میں بھری تھیں۔ گائے پلی تھی۔ مرغیاں، انڈے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کام کرنے کے لیے ایک دیہاتی عورت بھی آتی تھی مگر وہ اس سب کے باوجود لکھنؤ واپس آ گئیں۔ بھائی ابا کو ان کی اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ بھائی کے پاس کی تمام آسائشوں سے منہ موڑ کر میرے ساتھ مصیبت بھگتنے کو انہوں نے ترجیح دی۔ لے

لے اسی ہم آہنگی و تعاون کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ ان کو پینے پلانے پر کوئی راضی نہ کر سکا۔ حالانکہ بقول خود ان کے یاروں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لاہور میں جس مکان میں ہم لوگ رہتے تھے اس کے نیچے کی منزل میں جگر صاحب بھی رہتے تھے۔ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا اس زمانے میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اپنے رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش انہوں نے بھی کی۔ قیام حیدر آباد دکن کے زمانے میں کن کن لوگوں سے واسطہ پڑا، کیسی کیسی کوششیں کیں، وہ سب اماں کو بتا دیا کرتے تھے۔ شاعروں کی اکثریت نے

اس نجاست کو گلے لگانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی مگر ان کا جواب ایسے موقعے کے لیے یہی ہوتا تھا کہ ''میں اپنی معصوم صفت بیوی کو اپنی ذات سے ایسی ذہنی اذیت کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ اگر محبت و دوستی نبھانے کے لیے یہی شرط ٹھہری تو ایسی دوستی کو میرا دور ہی سے سلام ہے''۔

۱۹۲۴ء میں اٹاوہ چلے گئے، اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی ہیڈ ماسٹر صاحب کی بدولت۔ وہاں بھی حالات کچھ بہتر نہ تھے کیونکہ اسکول کی ماسٹری میں اس زمانے میں تنخواہ کل تیس روپے تھی جو وقتی طور پر کچھ نہ ہونے سے بہتر سمجھ کر کر لی گئی کہ بچوں کے لیے کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔ وہاں سے ایک رسالہ بھی ''صحیفہ'' نام سے نکالا تھا جو چل نہ سکا۔ پھر علی گڑھ میں بھی تقریباً چھ مہینے رہے تھے۔

۱۹۲۶ء میں لاہور میں آنا شروع ہوا۔ وہ اس طرح کہ تاجور نجیب آبادی نے جو نشر و اشاعت کا ادارہ قائم کیا تھا اس میں زیرِ طباعت کتابوں کی اصلاح کے لیے بلاوا آ گیا۔ ہم لوگوں کو علی گڑھ سے لکھنؤ پہنچا کر خود لاہور چلے گئے۔ جب مکان وغیرہ کا بندوبست کر لیا تو سب کو اپنے پاس بلا لیا۔ لاہور میں بھی دو سال کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔ انہیں دنوں پنڈی اور شملے کے مشاعروں میں بھی گئے تھے۔ اسی زمانے میں یہ نئے دوست بھی بنے۔ دوارکا داس شعلہ، عبدالطیف تپش، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خواجہ دل محمد دل، مرزا فہیم بیگ چغتائی، اور بھی ہوں گے جن کا علم مجھ کو نہیں کیونکہ ان حضرات کا تذکرہ گھر میں بھی کیا کرتے تھے اس لیے ان کے نام مجھ کو یاد ہیں۔

لاہور کی ملازمت چھوٹنے کا کیا سبب ہوا اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ مئی ۱۹۲۸ء میں میرے نانا ابا کے انتقال پر وہ لاہور سے ایک دن پیشتر پہنچ گئے تھے، اس کے بعد واپس نہیں گئے۔ لکھنؤ ہی میں پریشان حالی سے وہ زمانہ کٹتا رہا۔ پھر دکن جانے کی دل میں ٹھانی۔ نہ جانے کس طرح زادِ سفر مہیا کیا اور گھر میں مختصر سامان خورد و نوش رکھ کر اللہ بتوکل سوار ہو گئے۔ کس طرح گئے تھے، یہ ان ہی کا دل جانتا تھا۔ دس پندرہ دن بعد ایک پوسٹ کارڈ آیا۔ میرے نام زندگی میں یہ پہلا خط تھا ان کا، جس کی اثر انگیزی میرے قلب پر آج بھی اسی طرح سے نقش ہے۔ لکھا تھا کہ ''میری بچی! تیرا ابا کیسی مجبوری میں تم لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر نکلا ہے اور حال یہ ہے کہ دل کو قرار نہیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہاں کی گہما گہمی، آؤ بھگت، خاطر تواضع کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ ایک نواب صاحب نے آج میری بڑی پرتکلف دعوت کی تھی جس میں اور بھی بہت سے معززین شہر بلائے گئے تھے، انواع اقسام کی نعمتیں دسترخوان پر سجائی جا رہی تھیں، کچھ دیر مَیں وہاں کے انتظامات دیکھتا رہا اس کے بعد لوگوں کی نظریں بچا کر چپکے سے نکل آیا۔ اس احساس نے

مجھ کو وہاں نکلنے نہ دیا کہ میرے بچوں پر نہ معلوم کیا عالم گزر رہا ہوگا اور میں یہاں ایسی دعوتوں سے لطف اندوز ہوں، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ وہاں مجھے ہر طرف تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ میں جن صاحب کے ہاں مہمان ہوں ان کے کمرے میں بند تم کو یہ خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا کر رہا ہوں۔ دعا کرو کہ یہ آزمائش کے دن جلد ختم ہوں ہم لوگوں کے۔ آمین'۔

اپنے فرائض اپنی ذمہ داریاں ناگفتہ بہ حالات میں بھی ہمیشہ خود ہی پوری کرتے۔ کسی رشتہ دار کا بھی مرہون منت و احسان ہونا وقتی طور پر بھی گوارا نہ تھا بلکہ خود رشتہ داروں سے حسن سلوک سے پیش آنے کو کہتے۔ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ دل غنی رکھو دوسروں سے کچھ ملنے کی توقع کبھی نہ کرو بلکہ تم خود بڑھ کر کسی کے کام آ سکتے ہو تو آؤ، یہی بزرگی اور شرافت کی دلیل ہے۔ عزم و حوصلہ جس انسان میں ہوتا ہے وہ دوسروں کا منہ نہیں تکتا بلکہ وہ خود عمل کرتا ہے۔

اسی لیل و نہار میں زندگی کے دن کٹنے کے سبب میری پڑھائی خاطر خواہ نہ ہو سکی جس کا انہیں بھی افسوس تھا۔ اسماعیل میرٹھی کی تیسری کتاب تک انہوں نے خود مجھ کو پڑھایا، اس دوران گیپ بھی پڑتے رہتے تھے۔ پہلی کتاب اٹاوہ میں مجھ کو پڑھاتے تھے۔ پڑھانا اور وہ بھی چھوٹے بچوں کو ان کے بس کا کام نہیں تھا۔ ڈانٹ تو پڑتی ہی رہتی تھی، ایک دن جب کئی مرتبہ بتانے پر بھی کسی لفظ کے ہجے مجھے یاد نہ رہ سکے تو پاس رکھی ہوئی ایک موٹی سی کتاب میرے سر پر دے ماری اور اپنے سامنے سے ہٹ جانے کو کہا۔ میں روتی ہوئی ہٹ گئی۔ پھر سارا دن میں نے ان سے نہ بات کی نہ ان کی طرف دیکھا۔ میرا منہ پھولا رہا جس کو وہ محسوس کرتے رہے۔ اس دن رات کو گیارہ بجے جب اپنے دوست احباب کی صحبت سے اٹھ کر گھر آئے تو مٹھائی لیتے ہوئے، نیند سے ہوشیار کر کے کھلانے کی کوشش کرتے جاتے تھے اور ساتھ ہی کہتے جاتے کہ ''یہ آج مجھ سے بہت ناراض ہوگئی ہے۔ بس اب اپنا غصہ تھوک دو تمہارا بابا تم کو خاموش نہیں دیکھ سکتا، بس ذرا سی کھا لو کہ میرا دل ٹھنڈا ہو جائے، پھر زبردستی نہیں کروں گا''۔ بچپن کی نیند بھلا کچھ سمجھنے اور کھانے کی مہلت دیتی ہے۔ اس طرح ناز برداریاں بھی کرتے تھے اور غلط باتوں یا کاموں پر ڈانٹ بھی پڑتی تھی، کبھی گوشمالی بھی ہو جاتی تھی۔ انتہائی غصے میں بھی کبھی کوئی ناشائستہ لفظ زبان سے ہم لوگوں سے نہیں کہا تھا۔ نالائق، بے ہودہ، بدتمیز، بے وقوف جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے بس۔

اور سب بہن بھائیوں کی نسبت میرے حصے میں ان کا پیار زیادہ اور غصہ کم آیا کیوں کہ میں ہی ایک طرح ان کے نخل زندگی کا پھل تھی، مجھ سے پیشتر دو ضائع ہو چکے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماں سے زیادہ

پیار مجھ کو انہیں سے ملا۔ بچپن میں جیسی ناز برداریاں میری کیں اتنی کسی دوسری اولاد کی نہ کر سکے۔ زمانہ بھی ناموافق ہوتا چلا گیا۔

[عثمان آباد میں زندگی نے ذرا قرار پایا تو میرے لیے علامہ راشد الخیری کی ''شام زندگی'' کا سیٹ، خواجہ حسن نظامی صاحب کی کتابیں، جرجی زیدان کی تاریخی کتابوں کے ترجمے منگا کر دیے۔ جب سے اسلامی تاریخ کے حقائق سے واقفیت حاصل کرنے کا ان کو شوق ہوا تو جو کتابیں وہ پڑھتے تھے وہ سبھی کتابیں عربی میں تھیں۔ جیسے صحیح مسلم، صحیح بخاری، تاریخ طبری، مشکوٰۃ، تاریخ ابن کثیر، حیات القلوب، اور میں عربی سے نابلد تھی۔ میرے لیے جسٹس امیر علی کی تاریخ اسلام، عبداللہ امرتسری کی علیؓ ابن ابی طالب، نواب احمد حسین خاں کی تاریخ احمدی، نواب امداد امام اثر کی مصباح الظلم اور میر انیس علیہ الرحمتہ کے تمام مرثیے وقتاً فوقتاً مہیا کرتے رہتے تھے۔]

میر انیس کے مرثیے تحت اللفظ میں روانی کے ساتھ پڑھنا آسان نہیں۔ مختلف اوقات میں فرصت سے سامنے بٹھا کر مجھ کو پڑھوا کر سنتے اور پھر ہر طرح اس کی صحت درست کر کے بتاتے جاتے کہ الفاظ کی ادائی بھی صحیح ہو، وزن بھی نہ گرے، زیر زبر پیش بھی درست لگے۔ معانی و مطالب الفاظ کے بتاتے رہتے اس طرح میری اردو کی استعداد بڑھایا کرتے۔

[مذہب کے متعلق آپ کا نظریہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے مابین روح اور ضمیر کی تسکین کا معاملہ ہے۔ دل کی گہرائیوں سے جن عقائد کو قبول کر لے وہی اس کا مذہب ہے۔ موروثی یا اوپر سے تھوپنے والی چیز نہیں۔ میرے لیے مذہبی و تاریخی کتابیں مہیا کرنے میں یہی جذبہ کارفرما تھا کہ میں اپنے ضمیر کی روشنی میں اپنے عقائد کا تعین کر سکوں۔ عبادت کے ایک حد تک موافق تھے۔]

میں نے بچپن میں روزے رکھتے بھی دیکھا اور نماز پڑھتے بھی مگر پابندی سے نہیں۔ جب دل چاہتا تھا تو رمضان میں چار پانچ روزے رکھ لیتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے، خاص کر صبح کی نماز تو وہ یوں بھی اکثر پڑھنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت لحن سے کرتے جو کانوں کو بھلی لگتی۔ جب ان کو کسی قسم کی خوشی یا کامیابی ہوتی تو بطور شکر نماز ضرور پڑھتے تھے۔ [لکھنؤ کے مشہور و معروف خطیب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کی مجالس عشرہ محرم میں بہت شوق سے نانا ابا کے ساتھ روزانہ صبح کو جاتے۔ میں نے بچپن میں دیکھا تھا، جوان کے ذوق سماعت پر پورے اترتے تھے۔ حیدر آباد کی بڑی مجالس میں بھی جانے کا ذکر کرتے تھے۔ روز عاشورہ سروپا برہنہ جلوس علم میں شرکت کے بعد تمام دن فاقے سے رہتے اور مرثیہ

انیس پڑھ کر مغموم و محزون دن گزارتے۔ شام پانچ بجے تک سب کے ساتھ فاقہ شکنی کرتے۔ زندگی کے آخری دور میں بھی روز عاشورہ ہمیشہ مغموم رہ کر گزارنے میں فرق نہیں آنے پایا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تعالےٰ اور امام علیہ السلام نے حق کی خاطر جو ایثار و قربانی کی لازوال مثال اہل دنیا کے لیے غیر متزلزل کیریکٹر سے پیش کی اور جو کچھ دنیا والوں نے ان کے ساتھ سلوک برتا، اس محسن کشی پر وہ اتنے دل برداشتہ ہوتے کہ اس ذکر پر اکثر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ چونکہ وہ خود صاحب کردار تھے لہٰذا ان کے دل میں مقام بھی ایسی ہی ہستی حاصل کر سکتی تھی جو لازوال کیرکٹر اور بے پناہ عزم کی مالک ہو۔

۱۹۵۵ء میں بیماری کے دوران میں ان کے پاس چار مہینے جا کر رہی تھی، اور باتوں کے علاوہ ایک دن تفصیل سے ان کی ساری روداد بھی سنی۔ دوران گفتگو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ ''بابا میں آپ کے اندر وہ چیز محسوس کرتی ہوں جو اصحاب حسینی کے غیر متزلزل ایمان و یقین میں تھی۔ اگر سانحہ کربلا آپ کے دور حیات میں رونما ہوتا تو یقیناً آپ بھی ان جلیل القدر اصحاب کی صف میں ہوتے جس کا تصور بھی درد دل رکھنے والے انسان کو لرزہ براندام کر دیتا ہے''۔ یہ جملے سن کر ایک دم جیسے بجلی کا جھٹکا ان کو لگا۔ سر فخر سے بلند ہو گیا۔ ایک لمحے کے سکتے کے بعد بولے کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں گویا تم نے میرے عمر بھر کے زخموں پر جیسے آج پھایا رکھ دیا ہے۔ اس ایک جملے سے سچائی اور ایمان داری کو اپنے ہر شعبہ حیات میں برتنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ کسی مجبوری یا وقتی مصلحت کے تحت بھی ان کی فطرت بلند اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکی۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آیا ۴۴-۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ راشننگ کے نفاذ پر سختی سے عمل ہو رہا تھا۔ وہ اب مستقل قیام کے خیال سے لکھنؤ آ گئے تھے اور دن میں کئی بار چائے پینے کے عادی ہو گئے تھے۔ شکر کی قلت کے پیش نظر اماں نے ان سے کہا آپ اپنا کارڈ بھی بنوا لیجیے اور اس میں ایک نوکر کا بھی اضافہ کر لیجیے تا کہ کچھ شکر زیادہ مل سکے۔ چنانچہ وہ درخواست لے کر آفس گئے جو قریب ہی تھا۔ وہاں ان کو بتایا گیا کہ آپ نوکر کو لے آئیں تو کارڈ بھی بن جائے گا۔ وہاں سے واپس آئے، اس نئی صورت حال کے پیش نظر راستے ہی میں کھڑے ہو کر تھوڑی دیر سوچا کیے، اس کے بعد واپس راشن آفس جا کر کہہ دیا کہ جناب وہ نوکر تو نہیں آتا لہٰذا آپ صرف میرا ہی کارڈ بنا دیں۔ چنانچہ اپنا کارڈ بنوا کر لائے اور اماں کو واقعہ سنایا۔ یہ کہہ کر کہ لاحول ولا قوۃ آپ نے مجھ کو خواہ مخواہ نوکر کا لکھنے کو کہہ کر اتنی سی چیز کے لیے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ یہ سن کر ہم سب بہنوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا، ان کی سچائی کی بے چارگی پر

دوسرا واقعہ ان کی ایمان داری کی صفت جانچنے کا بھی اگر پیش کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ۱۹۲۲ء میں ''چراغ سخن'' چھپوانے کے لیے بہت بے چین تھے، جو کچھ ان کے پاس تھا اس میں کام نہیں بنتا نظر آتا تھا۔ سوسوا سو کی پھر بھی کمی تھی۔ جسے پورا کرنا ضروری تھا۔ جس مکان میں رہتے تھے اس کے دوسرے حصے میں پنجاب کے ایک قاضی صاحب نام۔ کے شریف انسان رہتے تھے۔ چونکہ مراسم ہر وقت کے ان سے تھے، ان کو اس بات کا علم ہوا تو خود انہوں نے بطور قرض سو روپے اصرار کر کے دے دیے کہ آپ اپنا کام اتنی معمولی رقم کی وجہ سے نہ اٹکا رکھیں، جلد مکمل کریں۔ ان کی رقم کی ادائیگی کرتے رہے مگر یک مشت نہیں دے سکے تھے تا آنکہ ۱۹۲۳ء میں نولکشور پریس کی ملازمت ہی ختم ہوگئی۔ اب ادائی کا کوئی سوا ہی نہ تھا۔ برسوں پریشانی میں گزر گئے اور وہ قاضی صاحب بھی لکھنؤ چھوڑ کر پنجاب چلے گئے۔ اب عثمان آباد میں جب ذرا حالات پرسکون ہوئے تو قاضی صاحب کی تلاش میں نہ معلوم کتنے لوگوں سے خط و کتابت کرتے رہے مگر ان کا پتا نہ ملتا تھا۔ بہت افسوس کے ساتھ اکثر کہتے تھے کہ ''قاضی صاحب بے چارے کے بیس روپے میرے ذمے باقی رہ گئے ہیں اور ان کا پتا نہیں، دل کہتا ہے کسی طرح یہ رقم ان کو پہنچاؤں''۔ اپنے ضمیر پر ایک بوجھ محسوس کرتے رہے جب تک اس مسئلے کو حل نہ کر لیا، وہ اس طرح کہ کسی شریف اور ضرورت مند انسان کی اس سے زیادہ رقم دے کر مدد کر دی، اس نیت سے کہ اس کا اجر اس آدمی کے لیے ہو جس کی یہ رقم میں دے رہا ہوں۔ غرضیکہ زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے واقعات ہوتے جو دور ابتلا میں ہم لوگوں کے لیے مشعل راہ بنتے۔ ورنہ یہ دنیا وہ امتحان گاہ ہے جہاں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ وہ کسی کی وجاہت دنیوی سے قطعی متاثر نہ ہوتے تھے بلکہ جس سے ان کا واسطہ پڑتا تھا اس کے باطن میں حسن ذاتی کی ان کی نگاہیں متلاشی رہتی تھیں اور اگر کہیں ایسی خوبیاں مل گئیں تو اس کی تعریف کرنے میں انہوں نے پھر بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں انہوں نے کسی کی شان میں مدح کے طور پر ایک مصرع بھی نہیں کہا۔ مگر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین قبلہ کی ذات گرامی کچھ اس طرح حسن ذاتی سے مزین تھی جس کے وہ دل کی گہرائیوں سے معترف تھے۔ ان کا ذکر خیر ہمیشہ بڑے خلوص سے کرتے، ان کی بزرگی برتری کا ذکر سر عام کیا کرتے۔ زندگی میں اگر کسی کی مدح کی تو وہ ان ہی کی ذات والا صفات تھی۔ دو رباعیاں ان کے لیے کہی گئی تھیں۔

حسن ذاتی کی جھلک کے وہ تمام عمر متلاشی رہے اور اس کے قحط کا شکوہ اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

یہ بلائے حسن کہاں نہیں مگر اپنے واسطے قحط حسن
تمہیں کیا بتائیں نظر کے ساتھ جو وقت نظری رہی

6

وہ خود بھی نہایت اعلیٰ صفاتِ انسانی کے حامل تھے جن کو دیکھنے سے دوسروں کی نگاہیں ہمیشہ قاصر رہیں۔ اپنی خودداری واستغنا کا بھرم ایسے نازک وقت میں بھی انہوں نے قائم رکھا اور پھر کس شان سے۔ تلاش معاش کے لیے جب حیدرآباد میں مختلف لوگوں سے ملنا جلنا رہتا تھا تو ایک نواب صاحب جو خطاب یافتہ اور بھائی ابا کی شاعری کے قدردان بھی تھے ایک دن کہنے لگے کہ "میں آپ کو حضور نظام سے ملوانے کا بندوبست کر رہا ہوں، سرکار ضرور آپ کو پسند فرمائیں گے کیونکہ آپ کا کلام ہی اتنا جان دار ہے۔ بس وہاں حضوری میں جاتے وقت آپ کو شاہی آداب کے مطابق شیروانی پر پیٹی کسنا اور دستار پہننی پڑے گی اور روبرو پہنچنے پر کمر سے جھک کر تسلیمات عرض کرنا پڑے گی، لمبے ہاتھ ہلا کر۔ آپ کے لیے دستار وغیرہ کا میں انتظام کیے دیتا ہوں"۔ اس سے زیادہ ان کی بات آگے چلنے ہی نہ دی۔ بولے، "بس بس نواب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اپنے میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ نظام کی صحبت میں جگہ پانے کے لیے ان کے اہل کاروں کی طرح بگلوس دستار لگا کر تسلیمات بجالاؤں۔ میں ایسے منصب وعہدہ پر لعنت بھیجتا ہوں جس سے میرا جذبۂ خودداری مجروح ہوتا ہے۔ مجھ کو تو حیدرآباد شہر سے بھی دور کسی جگہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے تو اسی کو اپنے لیے غنیمت سمجھوں"۔ غرض کہ یہ نواب صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے کہ یہ کس مزاج اور دل ودماغ کا شخص ہے۔ نظام تک پہنچنے کے لیے تو لوگ نہ معلوم کیسے کیسے جتن کرتے ہیں اور یہ پائے حقارت سے اس طرح ٹھکرا کر چلے گئے۔

اگر دوستی ان کی کسی کے ساتھ نبھی آخر تک تو وہ حضرت نجم آفندی صاحب کی ذات تھی ورنہ نہ معلوم کتنے اس راہ میں ساتھ چھوڑ گئے۔ ہم لوگوں کا آگرے میں قیام انہیں کے اصرار پر ہوا تھا کیونکہ بھائی ابا تو ملازمت کی مجبوری کے سبب دکن ہی میں رہے۔ آغا جان کی بیماری نے اتنا طول کھینچا دکن کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی جس کی وجہ سے علاج کے لیے بجائے دہلی کے آگرے میں ہی ہم سب کو چچا نجم کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا تھا۔ بھائی کہتے تھے تو بھائی کے بچوں کی طرح ہم سب کا خیال بھی رکھتے تھے۔ خدا مرحوم کو ہمیشہ اپنی رحمتوں سے نوازے۔

جب کبھی عظیم آباد کا ذکر ہوتا تو کہتے کہ ایک مرتبہ میرا دل چاہتا ہے کہ تم سب کو لے کر اماں کی قبر پر جائیں۔ مگر یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ عظیم آباد میں اب تھا کون جس کی محبت کھینچ لیتی۔ ماں باپ کجا، بہن بھائیوں میں بھی کوئی نہ تھا۔ دادی اماں کی ساری اولادوں میں یہی تو اکیلے زندہ بچے تھے۔ اپنا آبائی وطن ہونے کے باوجود پردیس لگتا۔ بچپن جس مکان میں گزرا ہو اس کو اجاڑ دیکھنے سے چند سیکنڈ میں کیا

کچھ انسان کے دل پر بیت جاتی ہے:

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے

ان کا شعران کے جذبات کی ترجمانی کے لیے کافی ہے۔

اپنے ذاتی استعمال کی چیزیں ہمیشہ بہت احتیاط سے مخصوص جگہ پر رکھتے تھے۔ کسی چیز کو ادھرادھر کر دینا نہایت ناگوار گزرتا تھا۔ اگر رات کو اندھیرے میں بھی ہاتھ سے اٹھانے کی ضرورت پڑے تو وہ چیز اسی مقام پر ملنی چاہیے۔ کسی کی دخل اندازی قطعاً ناپسند تھی۔ جو بچہ اس کا خیال نہ کرتا اس پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ صبح بیدار ہونے پر منہ دھونے کی سختی سے پابندی تاعمر قائم رہی۔ سردی چاہے کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو، طبیعت چاہے کتنی خراب ہو مگر یہ کام ہر حالت میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ سردی بہت تھی اور طبیعت خراب تھی، اماں نے کہا کہ کلی کر کے چائے پی لیجیے، پھر بعد میں منہ دھو لیجئے گا، جب دن ذرا چڑھ آئے پانی گرم کروا کے۔ اس پر بہت غصہ آیا بولے "کلی کرلوں! کلی کرلوں! کلی کر کے میں نے کبھی چائے پی ہے جواَب پیوں"۔

اپنے مخصوص اصول اور ضابطے کی خود بھی پابندی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے۔ کسی کے پاس ملنے جاتے تو اتنی ہی دیر بیٹھتے جتنا مناسب خیال کرتے، ضرورت سے زیادہ نہ خود کسی کے پاس وقت گزاری کے لیے بیٹھتے نہ دوسروں کا اپنے پاس بیٹھنا گوارا کرتے، تھوڑی دیر تو مروت برتتے۔ لاابالی پن سے باتیں کرنے پر بھی جب اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تو معذرت کے انداز میں کہتے کہ اچھا بھائی صاحب اب میں تو تھکا ہوا ہوں ذرا لیٹنے جاتا ہوں آپ ان لوگوں سے باتیں کریں۔

لکھنؤ میں سسرالی رشتہ داروں کے علاوہ کون تھا مگر کبھی کسی سے ان کے تعلقات کشیدہ ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ ہر ایک کا اس کے رشتے کے لحاظ سے خیال کرتے تھے۔ چند کے علاوہ سب ہی ان سے رشتے میں چھوٹے تھے۔ سالیوں کا اپنی ہی بیٹی اور بہن کی طرح خیال کرتے اور احترام ملحوظ رکھتے اور ان سب نے بھی ہمیشہ ان کا ادب ولحاظ اپنے بڑے بھائی کی طرح ملحوظ رکھا۔

بہن بھائیوں میں سب سے بڑی بھی میں ہی تھی اور ان سے زیادہ مانوس ہونے کے باعث مزاج شناس بھی تھوڑی بہت تھی، لہٰذا وہ مجھ سے کھل کر اکثر اپنے وسیع تجربے اور مطالعے کی روشنی میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے جس سے آئندہ کام آنے والی بہت سی باتیں مجھ کو مل جاتی تھیں اور ذہن کو جلا۔ زندگی میں اپنی راہیں متعین کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ اکثر یہ بھی کہتے تھے کہ میں نے اپنے بچوں کے

لیے کچھ نہ کیا بلکہ جو کچھ مجھ کو ورثے میں ملا تھا وہ بھی نہ رکھا۔ پھر خود ہی ہنس کر کہتے کہ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے فساد کی کوئی چیز تم لوگوں کے درمیان نہیں چھوڑی، اب تم لوگ خود ہی اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر جو کچھ کرنا چاہو وہ کرو۔ میرا کام دولت دنیا کے پیچھے بھاگنا نہیں تھا۔ فطرت نے مجھے جو صلاحیتیں دے کر بھیجا تھا، ان کے مطابق میں اپنا کام کر چکا۔

سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ہم لوگوں کو کچھ نہ دے کر بھی اتنا کچھ دے دیا کہ مزید مال دنیا سے کچھ دینے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ دنیا میں کم ہی باپ اپنی اولاد کو ایسا سرمایہ زندگی دے پائے ہوں گے جو زندگی کے ہر کٹھن مرحلے میں ان کے کام آیا ہو۔

تو یہ تھے ان کی شخصیت کے چند پہلو جو دنیا کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل ہی رہتے۔ لکھنے کو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ میرے پیش نظر ہے۔ بحیثیت اولاد مجھے ان سے جتنا قرب حاصل رہا وہ ظاہر ہے۔ اچھائیاں اور برائیاں کس شخص میں نہیں ہوتیں، باہر کا حال باہر والے جانیں میں تو ان کے متعلق یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میزانِ عدل میں اگر ان کی دونوں طرح کی صفات کو پرکھا جائے گا تو ان کی خوبیوں کا پلہ زیادہ وزنی رہے گا۔

ایک جھوٹ کی عادت دوسرے ایمان داری کا فقدان، شجر گناہ کی ان دو مضبوط جڑوں کو اگر کوئی انسان اپنے اندر پنپنے کا موقع نہ دے تو گناہوں کے بڑے سے بڑے ریلے سے نہ صرف اس کا دامن بچا رہے گا بلکہ اس میں سچائی کی طاقت، بلا کی خود اعتمادی اور کردار میں بلندی پیدا ہوگی اور یہ چیز اس کی فطری صلاحیتوں کے ابھارنے میں ہمیشہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔

ایک ہی شے کو مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو متضاد شکلیں بنتی ہیں۔ اسی طرح بھائی ابا کی شخصیت کو مختلف انداز نظر رکھنے والوں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور اپنے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ آئندہ زمانے کے لکھنے والے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے، اس وقت تک مخالفت کا گرد و غبار بھی چھٹ چکا ہوگا۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو آج بھی تلاش ہوتی ہے، کل اس سے زیادہ ہوگی اور ان کی شخصیت کے صحیح خد و خال پیش کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ان کے اشعار ہی سے جتنا سمجھا جا سکے گا بس اتنا ہی رخ دنیا کے سامنے آئے گا باقی سے لاعلمی رہے گی۔ یہی سوچ کر میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے آنکھ کھول کے جیسا ان کو پایا، باپ کے روپ میں، شوہر کے روپ میں اور بحیثیت انسان کے وہ بلا کم و کاست بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے حقیقی روپ میں ان سطروں میں پیش کر دیا ہے۔